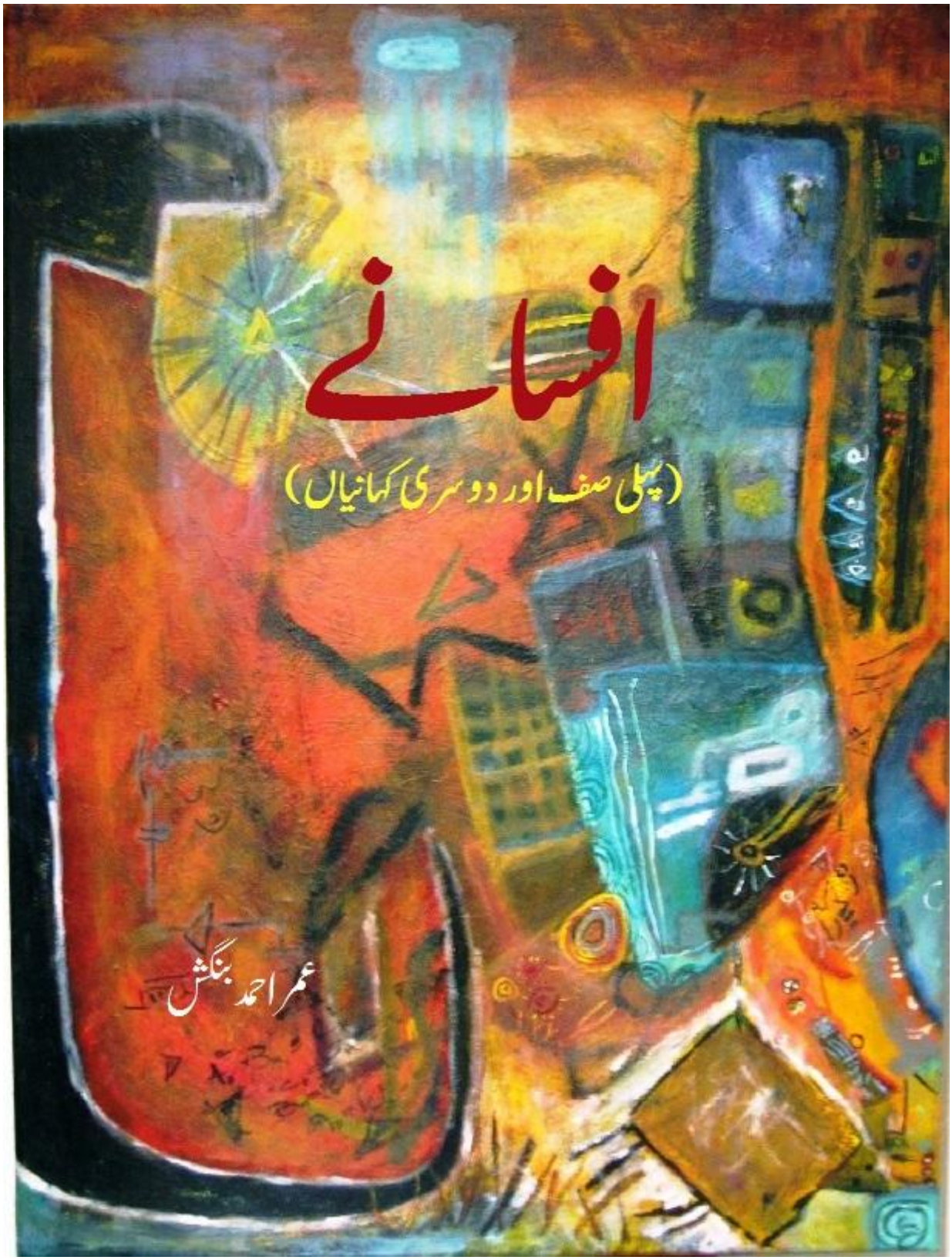
افسانے
(پہلی صف اور دوسری کہانیاں)
عمر احمد بنگش

افسانے

(پہلی صف اور دوسری کہانیاں)

عمر احمد بنگش

w: www.omerbangash.com | @: obangash@gmail.com| T: @obangash |FB: www.fb.com/sila.e.omer

Copyright © 2013 Omer Bangash

Cover: Snake Charmer (2006) - Connecticut

جملہ حقوق محفوظ ہیں

lulu.com

ISBN: 1304547434

ISBN-13: 978-1304547439

انتساب

کھوئی ہوئی جنت کے نام!

فہرست

پیش لفظ

حلال رزق

ناٹکا

پہلی صف

بوئے حرم پر ایک تبصرہ (ریاض شاہد)

بوئے حرم

چادر اور چار دیواری

چوکیدار کاکا

تئیس میل

ریل تال

کنہار کا کنارہ

کنواں کود لوں؟

تعارف

صلہ عمر بارے

پیش لفظ

لالے عمر کی آواز پہلے بار "گوگل ہینگ آؤٹ" پر ہی سنی تھی۔ متانت سنجیدگی ،ٹھہراؤ بہرحال ایک وصف ہے۔ آواز سن کر محسوس ہوا کہ سگریٹ انگلیوں میں سلگ رہا ہے اور خیالات دماغ میں ابل رہے ہیں۔ بلاگنے کا چسکا لگا تو جن پندرہ بیس بلاگروں سے متاثر ہو کر "پانچوں سواروں "میں شامل ہوا ان میں ایک لالا بھی ہے۔ اندر سے نرا پینڈو، لکھائی کا انداز ایسا کہ لسی کی گھڑوی میں مکھن کا پیڑا تیر رہا ہو، بندے کا جی چاہے ہاتھ بڑھا کر اپنی روٹی پر رکھ لے۔ اس کے خیالات کا بہاؤاپنا اپنا سا ہے ، اس کی تحریر اجنبی نہیں ہوتی، اس کے الفاظ میں غیریت نہیں جھلکتی۔ شاید زہنی ہم آہنگی کہہ سکتے یا اس کے الفاظ میں موجود دھرتی کا اپنا پن۔ لیکن کئی بار اس کی تحریر کو پڑھ کر لگا کہ یہ میں نے کہا، میں نے لکھا، یہ میں نے سوچا اور اس سے بڑھ کر کسی تحریر کی خوبی کیا ہو سکتی کہ وہ قاری کے ساتھ تعلق استوار کر لے۔ وہ سیدھے سادھے ، سچے کھرے انداز میں بات کہہ دیتا ہے۔ کبھی کوزہ گر کے سامنے رکھی مٹی کی خوشبو کا احساس دلاتے، کبھی کنہار کنارے دریا کی لہروں سے روشناس کراتے، کبھی درختوں کی ڈالیوں میں جھولتے، کبھی تھل کے اصیل گاؤں کا نقشہ کھینچتے۔ اور کبھی" بوئے حرم "کی تنگ گلیوں میں جھجکتے ڈرتے گزرتے ہوئے لالا سماج کے دوورخے مونہوں پر طمانچے رسید کرتا ہے۔ وہ سوچوں کو نچوڑ کر افسانہ گری کرتا رہتا ہے۔ عمر کسی بوڑھے سمدے کسان کی طرح تپتی دوپہر میں شیشمی چھاؤں تلے حقہ گڑگڑاتے داستان سرائی کرتا ہے، اور قاری، لڑکے بالوں کے جیسے محویت سے سنتا جاتا ہے۔ وہ الفاظ کو کتابوں سے نہیں نکالتا بلکہ مٹی میں سے نتھارتا ہے۔ دھرتی کی کوکھ میں سوچ کے بیج بوتا ہے تو تحریر کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ سچے کو دکھا کر کھبے چپیڑ مارنے کا ہنر اسے بخوبی آتا ہے۔ کہاں ،کس موڑ پر کب قاری کو چونکانا ہے، کب ٹھوکا دینا ہے، کب سوچوں کے بھنور میں دھکیلنا ہے اس کے انداز تحریر میں بہتیرے شامل ہے۔ انسانی مجبوریوں کو "حلال رزق" میں بیان کرنا، معاشرتی منافقت کو "پہلی صف" میں کھڑا کرنا اس کا خاصہ ہے۔ وہ انسانی نفسیات کا خلاصہ بخوبی کرتا ہے لیکن اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر۔ "کنواں کود لوں؟" کا سوال جہاں ہجر و فراق کی ٹیس محسوس کراتا ہے وہیں کچی عمر کی بے باکیوں اور نتیجتا ہولناکیوں کو ایسے میٹھے انداز میں بیان کرتا ہے کہ کہیں سے وعظ کا گمان تک نہیں گزرتا۔ "تیئیس میل" پڑھتے ہوئے یقین ہو چلتا ہے کہ بس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بھی لالا بیٹھا ہوا "فرنٹ مرر" سے سواریوں کی حرکات و سکنات کو گاڑی چلاتے ہوئے دیکھ رہا اور کنڈیکٹری بھی لالا کر رہا، قاری کسی آخری نشست پر دبک کر بیٹھا سارے منظر کو حیرانی سے دیکھتا جاتا ہے۔ "ریل تال" اور "ناٹکا" میں اس کے ڈائیلاگ نے جان ڈال دی ہے۔ خود پڑھئے اور سر دھنئے۔

لالے نے لکھنا کب شروع کیا معلوم نہیں۔ لیکن دیر سے لکھا یہ احساس ہے، اس کی تحریر کو اب تک پہچانا جا چکا ہوتا۔ شاید اسے اپنا آپ پہچاننے میں تاخیر ہوگئی اور اس تاخیر سے بے شک کچھ نہ کچھ نقصان بھی ہوا ہے۔ اس وقت گریزی کی بنا کبھی کبھار اس کا قلم کوئی فقرہ کہتے ہانپ جاتا، کانپ جاتا۔ شاید وہ کھل کر گالی نہیں دینا چاہتا یا لاشعوری طور پر کسی بھی قاری کو دکھیارا کرنا اس کے بس میں نہیں۔ اس کا ازالہ یہی کہ عمر لکھے، اچھا لکھے اور بہت لکھے تاکہ اس حساس دل کی دھڑکنوں اور پُر خیال زہن کی سوچوں سے قارئینِ اردو ادب کو بہترین مل سکے۔

عمران اسلم

حلال رزق

تارکول ڈلی پکی سرکاری سڑک صحرا کا سینہ چیرتی تیغ سیدھی تک سیاہ لکیر کھنچی ہوئی ہے۔ گاڑی بھاگتی جائے تو بیسیوں میل گزر رہتے ہیں پر کہیں موڑ مڑنے میں نہیں آتا، یہاں تک کہ صحرا پار ہوجاتا ہے۔ قدرے فاصلے پر سڑک کے دائیں بائیں بے ترتیب کچے راستے نکلتے ہیں جو صحرا کے اندرون پھیل جاتے ہیں۔ حوالے کاآخری سنگ میل قصبہ پچپن میل ہو تو دائیں جانب سے نکلنے والے ایسے ہی اک کچے راستے پر کھوہ والا، تیرہ میل اندرون تھل ٹیلوں کے بیچوں آباد ہے۔

پکی سڑک سے نکلنے والا یہ کچا رستہ کھوہ والا کے وسط میں جہاں پنچائیت کا چبوترہ واقع ہے، پہنچ کر ختم ہو رہتا ہے۔ اس کے برابر میں کچی اینٹیں گارے سے لیپ کر ایک مسجد کھڑی ہے جو دیکھنے میں بالکل مسجد نہیں ہے۔ اول اس کے روایتی مسجدوں کی طرح کوئی مینارہ نہیں، پھر قبلہ رخ دیوار کے وسط میں محراب کا کُب بھی نہیں نکال رکھا۔ مسجد کے نام پر یہ دس فٹ کا سادہ سا لمبوترہ مستطیل کمرہ ہے۔ سب سے اگلی صف کے بیچ کھردری اون کا مصلیٰ بچھا، بغل میں بودی لکڑ کی ایک اونچے پایوں والی کرسی منبر بنا کر محراب کا دھوکہ دے رکھا ہے۔ بقایا جگہ پر صرف تین صفوں کی گنجائش ہے جو پتلی صحرائی چلوتر تیلیوں کی بُن کر اہتمام سے بچھا رکھی ہیں۔ باہر برآمدہ پکی ریت سے لیپ کر ہموار ہے جہاں کبھی کبھار تبلیغی جماعت آنکلتی تو اپنا چولہا سلگا لیتی تھی، یہیں مولوی امین کا حجرہ بھی ہے۔ پنچائیت کے چبوترے ، مسجد اور اس کے پچھواڑے میں کنویں کے گھیر چار پھیرکھوہ والا گاؤں آباد ہے۔ گھر، مٹی کے ڈھارے یہاں وہاں بکھرے ہیں۔ صحرا کے ٹیلوں کی مانند انکی کوئی ترتیب نہیں، پھر بھی جیسے ٹیلے یک شان ہوتے ہیں، ویسے یہ بھی ایک رنگ اور ان میں بسنے والے سیدھے سادے صحرائی، ٹیلوں کی مانندخصلت میں اندر باہر یک رنگے لوگ۔

یہ کل وقتی کاشتکار مزدوروں کی بستی ہے جنھیں کدال چلانے، گوڈی کرتے، ڈنگر چار اور وزن ڈھونے کے سوا کچھ سمجھ نہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو جز وقتی نائیوں کا کام بھی جانتے ہیں، کپڑے سینے ہوں یا جوتوں کی مرمت، یہ کام عورتیں بخوبی کر لیتی ہیں تو درزی، موچی کی کوئی حاجت نہیں۔ کمہاروں کے البتہ دو گھرانے ہیں جو کل وقتی یہی قماش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ گاؤں بھر کے لیے مٹی کے برتن گھڑتے، ساتھ بڑے چوک میں بھی بیچ آتے سو نسبتاً خوشحال بھی ہیں۔

بستی گو کاشتکاروں کی ہے مگر کاشت کرنے کو بس کچھ ہی ایکڑ ہیں جو کبھی ٹیلے ہوا کرتے تھے۔ آج کے کھوہ والا کے پشتوں نے کبھی انھیں ہموار کر کے کھیت بنا لیے تھے ورنہ یہ اسی صحرائی ریت کے چٹیل کیے میدان ہی ہیں۔ معاملہ یوں ہے کہ ریت جہنم سی گرم رہتی ہے تو زرخیز مٹی کی پرت بے بس ہو جاتی ہے۔ مزید زمین کا پانی سیسے کے بھاری پن سے کڑوا کسیلا ہے ہونے کے سبب مارچ سے نومبر تک سبزہ اگنے کا سوال ہی نہیں۔ جاڑے میں بھی اس میں جان بھرنے کو سارے گاؤں کے کل نفس جت جائیں تو کہیں جا کر صرف ربیع فصل کاشت ہوتی ہے۔

*****

اکتوبر چڑھ آیا ہے، بسبب گاؤں بھر میں گہما گہمی ہے۔ وہ مرد جو پچھلی فصل اٹھا کر مزدوری کرنے نکلے تھے بیج اور کھاد لے کر واپس لوٹ آئے ہیں۔ ناریاں جنھیں ساری گرمیاں تپتی ریت سے زیادہ اپنے محبوب کی یاد جلاتی رہی ہے، دیدار نصیب ہوتے ہی ان سانولے چہروں پر لالی در آئی ہے۔ پھر بیویاں ہیں جنھوں نے سال بھر اپنے مجازیوں کے گھر بار کی رکھوالی کی ہے ان کے لیے جہاں چڑھتا جاڑا زمین کی ہریالی کا پیغام لایا ہے وہیں ارمان بھی جاگ اٹھے ہیں۔ اگلی فصل اٹھے گی تو اس کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ ان کی گودیں بھی بھر رہیں گی۔ صحرا کے ان مضبوط جوانوں کے کمزور، بوڑھے ماں باپ بھی ہیں مگر ان کا حال کوئی نہیں بتا سکتا۔ ان کے سینے میں جو ٹھنڈ بیٹوں کی واپسی نے تانی ہے اس کا نہ تو کوئی اندازہ کر پائے گا اور نہ حساب رکھ سکتا ہے، صحرا کی حدت تک اس ٹھنڈک کے سامنے ہیچ ہے۔ اکتوبر کی تاثیر، سب سے بڑھ کر کاشتی کھیتوں پر عیاں ہے۔

یہاں، ہل کے آگے بیل کی جوڑیاں جوت کر ریت کے اوپر زرخیز مٹی اتھل پتھل کی گئی تو خدا خبر کہاں سے رنگ برنگے پرندے اڑ اڑ آئے۔ یہ ہل کے کھرپوں کے پیچھے اڑتے جاتے ہیں، چُن چُن کر صحرائی کیڑے چونچوں میں دبائے چلے جا رہے ہیں۔ جیسے جیسے بیل آگے ہل چلاتے ہیں، ان کے پیچھے عورتیں لمبے بانس کے سرے پر ٹکائے دستی کھرپوں سے روڑے باریک کرتی جاتی ہیں۔ پھر بڑے بوڑھوں کو کھیتوں میں بلا لیا گیا ہے۔ ان کی موجودگی میں سارے رقبے پر پہلے زہر لگا بیج اور پھر کھاد کی بجائی کر کے ریت کو دوسرے ہل سے دبایا گیا تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کھو ہ والا کا ہر باشندہ خدا کے حضور اپنے پورے برس کی محنت یوں ویرانے میں سپرد کرنے کی عرضی ڈالتا ہو۔ ٹھنڈے پڑتے صحرا میں اصل رنگ اس وقت جوبن پر آیا جب پیٹر انجنوں سے پہلا پانی چھوڑا گیا۔جی جاندار تو رہے ایک طرف، بے جان ریت تک میں جیسے زندگی دوڑ گئی ہو۔ بچے جانگیے پہنے جہاں پانی کا منبع گرتا تھا، ریت کے کھڈوں میں کود پڑے۔ یہی پانی یہاں سے برآمد ہو کر ریت کے کھالوں سے ہوتا کھیت سیراب کرتا جاتا۔ جوان ریتلے کھالے سنبھالنے میں مگن ہیں تو بوڑھے پیٹروں کے پاس چارپائیاں ڈال کر کئی کئی گھنٹوں حقے گڑگڑاتے رہے۔

*****

گندم بو چکے تو کھوہ والا کی راتیں جاگنا شروع ہوئیں۔ شام کو ریت ٹھنڈی پڑتی تو سارا گاؤں چبوترے پر نکل آتا۔ کنویں پر آگے پیچھے کئی عورتیں سر پر مٹی کی گڑویاں اٹھائے رش لگاتیں۔ جوان لڑکیاں رنگ برنگے کپڑے پہن ، سج دھج کر نکلتیں ۔ کنویں پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھنکھناتے قہقہے بلند رہتے، یہاں جوان لڑکے چبوترے پر بازیاں لگاتے ۔ بچے جمعراتوں کروڑہ مروڑہ کھیلنے میں مگن ہیں تو بوڑھے حقے سلگا، ریت میں دھنسی چارپائیوں پر بیٹھ کر ماضی ٹٹولتے رہتے ۔ تب ہر بار بحث گھوم پھر کر فصل پر جا ٹکتی۔ جیسے بابے سمدا ایک روز چارپائی پر لیٹے ،حقے سے دھواں بھر بھر نتھنوں سے ہوا میں اڑاتے ہوئے ساتھ مونڈھے پر بیٹھے شفیے سے کہنے لگا،

"شکر ہے تیسرا پانی بھی لگ گیا۔ ابا تیسرے پانی پر خالص گھی میں حلوہ تلوا کر بانٹا کرتا تھا، اب تو خالص گھی بس سونگھنے کو ہی مل پاتا ہے۔ کہاں رہا اب وہ سستائی کا زمانہ۔۔۔" شمسو کمہار بابے سمدھے کو ماضی سے کھینچ کر واپس مدعے پر لے آیا تو اس نے مزید کہا،

"بس دو پانی اور لگ جائیں تو کام اچھا ہو جائے گا۔ بس خدا کرے کہ ایک دو چھاٹیں بدل کی بھی برس لیں تو فصل جی اٹھے گی، اب تو

بارش بھی پہلے کی طرح نہیں برستی، جب بدل آتا ہے تو خاصی دیر ہو جاتی ہے ،دانہ پک جاتاہے۔ مولا کا نام لیوا جو کم ہو گیا ہے ناں۔۔۔"
اس پر شفیے نے جو ہتھیلی پر تمباکو رگڑ رہا تھا، کچھ کہنا ہی چاہا کہ مولوی صادق تسبیح کو روک لگا کر بیچ میں بول پڑا،
"باوے سمد، خدا کی رحمت تو اس کا خیال رکھنے میں ہے، اس کے گھر کی خدمت کرو گے تو وہ تمھارے رزق میں برکت ڈالے گا۔" شفیے نے مولوی صادق کی ہی ہاں میں ہاں ملائی،
"میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا، اس بار فصل اٹھنے پر سب سے پہلے مسجد کی پچھلی دیوار اکھاڑ کر محراب بنوانی چاہیے، فرش بھی دیکھو پھر سے اکھڑ رہا ہے۔۔۔ اللہ بھلی وار کرے تو تین بوریاں سیمنٹ کی میرے زمے سہی۔۔۔"۔ مولوی صادق نے دبے لفظوں وظیفے میں اضافے کی طرف بھی توجہ دلائی توبابے سمدے نے چارپائی سے اٹھتے جھوٹے منہ یقین سا دلاتے اپنے بیٹے نور محمد کو پکارا کہ ڈھور ڈنگر تو اس نے سارا ہانک کر باہر چبوترے کے سامنے کیکر اور شریں تلے باندھ دیا تھا پر کھرلیاں ابھی تک ویسی ہی سوکھی پڑی تھیں۔
ان، جان پڑتے کھیتوں میں تب نور محمد، ڈنگر باہر باندھ کر، چبوترے پر سے نظر بچا کر نکلتا اور گاؤں سے باہر شمی سے ملنے جایا کرتا۔ نور محمد سمد کاشتکار کا بیٹا، سالہا سال صرف گندم بجائی اور فصل کٹائی کے لیے ہی گاؤں آتا۔ اس کے علاوہ پورا سال ٹھیکیدار کے ہاں سڑک کی مزدوری کرتا ،پتھر توڑتا، مسالہ گھولتا، یہاں تک جان مار کر تارکول تک چھڑکنے میں جت رہتا مگر جان کھوہ والا میں اٹکی رہتی، جہاں شمی نے اس سے پیمان کر رکھا تھا۔
شمی انیس سال کی سانولی رنگت والی، جیسے دمکتے سونے کی ڈلی ہو۔ شاویز کمہار کی بڑی لڑکی تھی جو گاؤں بھر کے لیے برتن بناتا ہی تھا، شہر کے دو ایک بیوپاری بھی اس سے لمبی گردن والی صراحیاں، گلدان اور پھولے ہوئے ڈولے بنوا کر لے جاتے تھے۔ اللہ کی دین، اچھا خاصہ دھندہ تھا، سو شمی اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتے بٹاتے خود بھی خاصے ڈیل ڈول والے برتن بنانے لگی تھی۔ شمی کے ہاتھ چپٹے اور انگلیاں لانبی تھیں۔ شاویز کہا کرتا تھا کہ شمی سچی کمہارن ہے، سنہری مٹی کی مورت، مٹی میں جان ڈال دینے والی۔ شاہ ویز صحیح کہا کرتا تھا، اس کا جو رنگ، قد کاٹھ نکالا تھا اور پھر جب دو سال قبل نور محمد سے پیمان باندھا تو جیسے جی توڑ مزدوری کے مارے اس مٹی کے پتلے میں واقعی جان ڈل گئی تھی۔
تیرھویں کا چاند اور ریت کے ٹیلے ٹھنڈی سپید روشنی میں چمکتے، نظر میں ایسی مٹھاس گھولتے تھے گویا مصری کی ڈلیاں کُوٹ کر یہاں وہاں ڈھیریاں بکھیر رکھی ہوں ۔شام بھر پرندے چہچہاتے اور مکوڑے بولتے۔ صحرائی سانپوں کی سنسناتی آوازیں تک دلکش معلوم ہوتیں۔ شام کے پھیلتے سائے میں جب سارا گاؤں چبوترے پر سرشار تھا، نور محمد نظر بچاتا اور یہاں تک دیکھ بھال کر پہنچا تھا، شمی کو دیکھتے ہی بے باک ہو گیا۔ اسے اپنے مضبوط بازؤں میں بھر لیا اور یہ سمٹی ہوئی بیخود اس سے آن چپکی۔ اس پر یکدم ہی نور محمد کو اپنا گُٹھا ہوا مضبوط جسم پگھل کر شمی کے وجود میں گھلتا محسوس ہوا، جس نے اپنی نرم روئی کے جیسی پتلی بانہیں اس کے گرد یوں لپیٹ رکھی تھیں جیسے ڈر ہو کہ اگر ان کو ڈھیلا چھوڑ دے گی تو خود کلال کے تازہ مٹی کے کاسے کی طرح لڑھک جائے گی۔ نور محمد نے اپنے سینے میں کھبتا ہوا شمی کا چہرہ انگلیوں کی پوروں سے دھیرے سے اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ نور محمد ایک دم سے پیچھے ہٹ گیا اور شمی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ سہلاتے پچکارتے ، دیر بعد شمی معصوم بچے کے جیسے ہچکیاں لیتے ہوئے بتانے لگی،

"ابے نے میرے رشتے کی بات کی ہے ، تم میرا ہاتھ مانگ لو" نور محمد کو سانپ سونگھ گیا،
"مگر میرے پاس تو ابھی بیاہنے واسطے رقم نہیں ہے، تو ابے کو منا لے، بس دو سال مزید دیکھ لے۔" اس پر شمی پھٹ پڑی،
"وہ نہیں مانے گا۔ ماں نے میرا جہیز باندھ لیا ہے، چاندی تک منگوا رکھی ہے اور پھر تو جانتا ہے کمہاروں کو۔ رشتہ مانگو نہیں تو بھی ایکدم ہو جاتا ہے، تو بس مجھے اپنے ساتھ لے جا۔" نور محمد نے شمی کو بہتیرا سمجھایا کہ صحرائی لوگ یوں پیچھے نہیں ہٹا کرتے، اپنی بنیاد چھوڑنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اسے یہ بھی فکر تھی کہ شمی کہاں اس کے ساتھ پردیس میں خوار ہوتی پھرے گی۔ بالاخر یقین دلانے کو فصل کی تسلی ہی کام آئی۔ طے یہ ہوا کہ اس بار فصل اٹھے تو وہ ساری بچت اس کے باپ کے قدموں میں لٹا دے گا بس وہ بہار تک اسے منا لے۔

*****

لق و دق صحرا کے ریت کے ٹیلوں میں کھوہ والا کے باہر چند ایکڑ سبزہ بہت بھلا معلوم ہورہا ہے۔ دور سے دیکھیں تو جیسے کوئی سبز ہرا قالین بچھا ہو اور اگر فصل کے بیچ کھڑے ہو جائیں تو گویا کھیتوں کے باہر ٹیلوں کی بے جان ریت سورج کی حدت سے نہیں بلکہ اس رقبے میں پنپتی زندگی سے حسد میں جلتی ہو۔ سورج کی تپش بھی اس رقبے پر مہمیز کا کام دے رہی ہے۔ ہر جاگتے دن کے ساتھ فصل میں جان پڑتی جاتی ہے تو ویسے ویسے کھو ہ والا کے باسیوں کے بھی جی کھلتے جا رہے ہیں ۔ اس برس تو بادل بھی ابھی سے گھر گھر آئے ہیں، سویر کے تڑکے میں مینہ برسنا شروع ہوا ہے تو صحرا میں صبح نکھر گئی ہے اور کھیت ہیں کہ جیسے نئی آن بان سے تنے کھڑے ہیں۔ آسمان سے برسا پانی بے شک زمین سے کھینچے ہوئے سے بڑھ کر اثر دکھا رہا ہے۔ پیٹ کی آگ تو بجھنی ہی ہے اب تو ایسا لگتا ہے کہ مسجد میں سفیدی کے ساتھ ساتھ مولوی امین کا وظیفہ بھی بڑھ ہی جائے گا، خدا بے شک بہت مہربان ہے۔ شمی اس شام بہت خوش ہے کہ فصل پر سویرہوئی چھاٹ نے اس کی امید بھی بڑھا دی ہے۔

صحرا میں بارش کے بعد سے فضا مرطوب ہو رہی ہے اور سبز فصل کے بیچوں بیچ کھڑے ہونا اب تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ حبس بڑھ گئی ہے تو اس کا نتیجہ کچھ ہی دنوں میں یہ رہے گا کہ فصل سنہری ڈانڈے بنی لہک رہی ہو گی۔ اسی سبب پورے کھوہ والا میں اب اور ہی سماں ہے، فصل کٹائی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یہاں اگر درانتیاں لوہاروں کے ہاں بھٹی میں دھاری پر تیز ہونے کو پک رہی ہیں تو وہاں عورتیں بوریاں سینے میں مصروف ہیں ۔ اگر دن میں گرمی سے لوگ نیست ہو کر سو پڑتے ہیں تو نسبتاً بہتر رات بھر دیر تک احاطوں کی صفائیاں کی جا رہی ہیں۔ تقریباً لوگوں نے مزدوریوں سے چھٹی لے لی ہے۔ گاؤں کی واحد ٹریکٹر ٹرالی والے مرشد علی کو کہلوا کر شہر سے واپس بلوا لیا گیا ہے اور گھروں میں کوٹھواروں کو صاف کر کے ابھی سے کڑوا دھواں مار کر کیڑے مار دوائی کا چھڑکاؤ بھی کر دیا گیا ہے۔ فصل سنبھالنے میں مہینہ بھر تو لگ جائے گا، سو مصروفیت رہے گی۔ اسی لیے ضروری راشن وغیرہ بھی ڈھو دیا گیا ہے اور شہر کے تمام کام نبٹائے جا رہے ہیں، تاکہ یکسوئی سے سال بھر کے رزق کا انتظام ہو سکے۔

*****

فصل کٹائی میں بس دو ہفتوں کی دیر ہو گی کہ ایک رات جب تیسرا پہر پار ہونے کو تھا، مولوی امین نے ابھی مسجد کے باہر برآمدے میں قبلہ رو کھڑے، کان پر ہاتھ دھر کر فجر کا بلاوا دینا ہی کیا، اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔ گاؤں بھر کے بڑے بوڑھے جوانوں کو سوئے پڑے کوس اور عورتوں کو چاٹیاں رڑکتے چھوڑ مسجد کا رخ ناپا۔ اذان ابھی اشہد کے وسط میں تھی کہ ایک مکوڑہ مولوی امین کی گردن پر روڑے کی طرح آن لگا اور سپٹ نیچے پیروں میں گر گیا۔ کان چھوڑ اس نے گردن کھجائی۔ نیچے دھری لالٹین کی روشنی میں دیکھتا ہے کہ ایک ٹڈی اس کے منہ کے آگے سے ہوا میں تیر گئی۔ مولوی امین کے حلق میں اشہد اللہ لرز سی گئی۔

جلد ہی سارا گاؤں پیروں پر تھا جن کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔ تیار فصل پر ٹڈی دل حملہ کر گئی اور سارا انتظام دھرے کا دھرا رہ گیا۔ دعائیں، دوائیں اور محنت سب اکارت گئی۔ پھوٹتی روشنی میں دیکھتے ہی دیکھتے جہاں جہاں سبزہ دکھتا تھا ٹڈی دل ڈانڈوں تک کو چٹ کیے جا رہا تھا۔ کھلے میدان میں اگر ٹڈیاں جیسے سیاہ مرغولے اڑتی پھر رہی تھیں تو زمین پر گویا ان کی بکھائی تھی۔ کھیتوں میں تو یہ حال کہ کوئی ہرا ڈانڈہ دانے تک انھوں نے کورا نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ جڑوں کو بھی اوپر سے نوچ گئیں۔ سبزے پر بھر کر یہ وہیں پڑتی گئیں اور یوں دوپہر تک کھیت ٹڈیوں سے اس قدر اٹ گئے کہ اگر کوئی زمین پر پیر دھرتا تو قدموں کے نیچے بیسیوں ٹڈیاں کچلے جانے سے چر چرا جاتیں۔

سارا کھوہ والا دن بھر اپنی بربادی تاڑ چکا تو شام میں چبوترے پر اکٹھ ہوا۔ کسی کے حلق سے کچھ برآمد نہ ہوتا تھا، نک دلی عورتیں باقاعدہ بین کر رہی تھیں اور مردوں کی جیسے آواز حلق میں رندھ کر جکڑی گئی ہو۔ اب یہ کچھ روز کا ہی معاملہ تھا، جب پچھلے سال کی گندم ختم ہو رہتی تو کھوہ والا کے باسیوں کو فاقے دیکھنے تھے۔ بیج کھاد اور دوائیاں قرض پر اٹھائی تھیں اس کا طوق علیحدہ سے ان کے گلے میں لٹکنے والا تھا۔ اب وہ پیٹ کو پالتے یا قرضے اتارتے، کسی کو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا اور چھٹکارا تھا نہیں۔ سو دیر تک بڑے بوڑھوں میں بحث چلتی رہی۔ نور محمد بجھ کر، بوجھل قدموں کھیتوں میں جا کر بیٹھ رہا۔ رات گئے اک فیصلہ کر لیا گیا۔

*****

سویر ہوئی تو کھوہ والا کے مرد، عورتیں اور بچے بیلچے، جالی دار کپڑوں کی چادریں اور خوانچے لیے گندم واسطے سلی بیسیوں بوریوں میں کھیتوں سے ٹڈیاں جمع کرتے رہے۔ جالی دار چادریں عرض کھول کر سبزے کے آس پاس دن بھر لٹکائے رکھیں، یوں اڑتی ٹڈیوں کا شکار بھی ہوتا رہا۔ الغرض شام گئے ہر گھر کے کوٹھوار میں ٹڈیوں سے بھری کئی بوریاں، گویا اس سال کی فصل ربیع محفوظ پہنچ رہیں۔ اس رات کھوہ والا کے باسیوں نے پہلی بار شریعت کی رو سے ٹڈیوں کا حلال رزق پکا کرکھایا۔

چند روز بعد نور محمد کئی نوجوانوں بشمول نوعمر لڑکوں کو ساتھ لیے ٹھیکیدار کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ جس بہار کا وعدہ اس نے شمی کے باپ سے لیا تھا وہ اب کئی سالوں تک لوٹ کر آنے والی نہیں تھی۔

اگست، 2013ء

ناٹکا

"او بھڑوے، ایک پتی والا پان لگائیو۔۔۔" محمد شوکت عرف شوکی اداس نے سڑک کے بیچ سے ہی منہ پھاڑ کر آواز لگائی مگر کھوکھے والا بدستور منہ پر کھڑے گاہکوں کو سگرٹ پان اور ٹھنڈی بوتلیں برتانے میں مصروف رہا۔

"تیرے کان میں بھی حرام اگ آیا ہے کیا؟ جلدی سے پان لگا۔۔۔" شوکی جو اب فٹ پاتھ پر تھا، یوں مخاطب کیا تو شنوائی ہوئی مگر منہ پھاڑ کر گالی واپس کی گئی۔ پھر مزید کچھ کہے کھوکھے والے نے کاغذ کی پڑیا میں لپٹا پان اسکی جانب اچھال دیا۔ شوکی تیز پتی والا پان منہ میں اڑس، ہلکے دانتوں سے چباتا تھیٹر کی جانب بڑھ گیا۔

تھیٹر کے داخلی راستے میں سامنے کی دیوار پر اشتہار آویزاں ہے۔ آٹھ فٹ چوڑی اور پانچ فٹ عرض کی پینا فلیکس پلاسٹک کے اشتہار پر تین مقامی اداکاراؤں کے میک اپ زدہ چہروں کی خاصی مضحکہ خیز تصویریں چھپی ہیں۔ ان تصویروں کے ارد گرد کی خالی جگہ پر لگ بھگ آدھے درجن اداکاروں کی تصویریں چھوٹے گول دائروں میں اشتہار کے سرمئی پس منظر میں یوں بکھری ہیں کہ مٹی میں رُلتی بلوروں کا گماں ہو۔ نیچے کے ایک کونے میں معاون اداکاروں کے نام درج ہیں جن میں ایک نام شوکی اداس کا بھی ہے۔ سرراہ ٹنگے اتنے بڑے اشتہار پر اپنا نام دیکھ کر اس کا سینہ چوڑا سا ہو گیا۔

اشتہار میں اپنے نام کے سرور سے سرشار، منہ میں پان دبائے، جبکہ ہاتھ میں پان کی کتھے سے رنگی ہوئی پڑیا کا کاغذ مسل کر روڑی بناتا ہوا داخلی راستے سے گزر رہا، توروڑی ایک جانب کو اچھال کر کتھے سے لال ہوتا ہاتھ دیوار پر رگڑ کر پونچھا اور پھر تیل پلائے لانبے بالوں پر پھیرتے ہوئے بائیں ہاتھ پر ٹکٹ کی کھڑکی کی جانب مڑ گیا۔ کھڑکی کے سامنے ٹکٹ خریدنے والوں کا اچھا خاصہ مجمع ہے کہ آج رات شہر کی مشہور رقاصہ جلوے دکھانے کو سٹیج پر اترنے والی تھی۔ یہاں رک کر اس نے داہنے ہاتھ سے کان میں ڈلی بالی کو ادب سے چھوا گویا کسی مزار کی جالی پر ٹنگی منت ہو۔ پھر ماتھے پر ہاتھ ٹکا کر باآواز بلند اجتماعی سلام گزار کیا۔ چند ایک نے مڑ کر دیکھا مگر جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔ رش میں سے راستہ بناتا ٹکٹ کی کھڑکی کے ساتھ ملحق پروڈیوسر صاحب کے دفتر میں حاضری دینے کی غرض سے آگے بڑھ کے دروازہ کھول، اندر داخل ہو گیا۔

دفتردس ضرب بارہ فٹ کا معمولی کمرہ ہے جس کا فرش کھدڑا ہوا ہے۔ میلی دیواروں پر فلمی پوسٹر چسپاں ہیں، جن میں سے اکثر کی روشنائی اب عرصہ گزر جانے پر مدھم پڑ گئی ہے۔ اسی سبب دیواریں خاصی بھدی محسوس ہو رہی ہیں۔ کمرے کے وسط میں ایک چوکور میز پر الا بلا دھر رکھا ہے، جس کے گرد ایک دفتری اور سامنے تین مہمانوں کی کرسیاں ترتیب سے بچھی ہوئی ہیں۔ دروازے سے داخل ہوں تو دائیں طرف کی دیوار کے ساتھ جوڑ کر ایک پرانے فیشن کا صوفہ بچھا ہوا ہے جو اس کمرے کے حساب سے خاصہ بے ڈھنگ محسوس ہوتا ہے۔

دفتر میں اس وقت پروڈیوسر صاحب کے ساتھ سٹیج ڈراموں کی اداکارہ شبانہ اپنی ماں کے ہمراہ موجود سنبھل کر بیٹھی ہے۔

شبانہ کو سٹیج کی دنیا میں اصل نام سے کم ہی لوگ جانتے تھے، فلمی نام شب چوہدری ہر خاص و عام میں یکساں مقبول ہے۔ یہ پانی چڑھے سونے سے لدی پھندی، خاصے چست ریشمی لباس میں اپنے تئیں کھلتی مسکراہٹ سجائے، ایک ادا سے کبھی بالوں کی لٹ سنبھالتی اور

پھر سنہری چوڑیوں سے کھیلتی ہوئی پروڈیوسر صاحب کی طرف متوجہ ہو کر یوں پینترے بدلتی بیٹھی ہے کہ اس کے طور کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ ایک لمحے کو اگر خاصی بے باک نظر آتی ہے تو دوجے لمحے یوں سنبھل جائے کہ جیسے گھٹڑی ہو۔ پروڈیوسر صاحب پچاس کے پیٹے میں درمیانے قد کے آدمی ہوں گے، شبانہ کے پہلو میں اس پر یوں جھک کر کھڑے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمر میں یہ خم ازلی ہے۔ اس پر یوں جھک کر وہ خدا جانے شبانہ کو کیا سمجھا رہے تھے۔ پروڈیوسر صاحب کی سرگوشیاں سی گو اس کو سنائی نہ دی پر شبانہ ایسے دکھتی ہے جیسے کوئی پتلی ہو جس کی ڈور پروڈیوسر صاحب نے تھام رکھی ہے۔ پروڈیوسر صاحب کی ہر بات اور اشارے پر اثبات میں اک ناز سے جی ہاں، جی ضرور کی رٹ الا پتے تھک نہیں رہی تھی اور سامنے کرسی پر بیٹھی اس کی ماں اس پر اپنے دونوں ہاتھوں کو آگے کھینچ کر مٹھیاں بنا کر سر تک واپس کھینچ کر بلائیں لیتی جاتی۔ باوجود اس عورت کی خوشامد یوں تو خاصی بے تکی محسوس ہوتی ہے مگر پھر بھی یہ ایسی ہوشیار ہے گویا کسی تیار باغ کا مالی ہو۔ شوکی کو یوں اس طرح بے دھڑک دفتر میں گھستے دیکھ کر پروڈیوسر صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ اسے وہیں کھڑے کھڑے جھڑک دیا،

"بے تو یہاں کاہے کو گھسا چلا آ رہا ہے؟ سیٹھ کی اولاد کو دیکھو۔۔۔ شو شروع ہونے میں پندرہ منٹ باقی ہیں اور یہ لاٹ صاحب ابھی تشریف لا رہے ہیں۔۔۔ سین کی تیاری تیرا باپ کرے گا؟"

شوکی کھسیانا سا الٹے قدموں باہر نکل آیا۔ ہال کے ہنگامی راستے سے گزرتے ہوئے بڑبڑایا،

"حرامی کا بڑھاپا دیکھو اور کیسے سلیش کی طرح چپک رہا تھا۔"

یہاں سے سیدھا چلتے ہوئے یہ ہال کے بالکل پچھواڑے پہنچ گیا جہاں سے نیغ سیدھا ڈریسنگ روم کی پشت کا دروازہ کھلتا ہے۔ ڈریسنگ روم میں خاصہ شور مچ رہا ہے۔ اسے اپنے سین کے لیے تیاری برتنے میں بمشکل پانچ منٹ لگے اور یہ وہاں سے باہر گیلری میں نکل آیا۔ آج رات ڈرامے کے تین شو تھے۔ دو گھنٹے کے ناٹک میں شوکی کا کردار ایک محافظ کا ہے جو ملیشیا لباس پہنے، ہاتھ میں بندوق اٹھائے بس چند منٹ کے لیے مرکزی اداکارہ کے ساتھ سٹیج پر نمودار ہوتا ہے۔ پھر دو ڈائیلاگ ہکلاتے ہوئے یوں ادا کرنے کہ معنی فحش ہو جائیں اور آخر میں دوسرے کرداروں کے ہاتھوں چند فقرے لپیٹ کر اور جھوٹ موٹ کی مار کھا کر ہٹ رہتا۔ اس مختصر سین کے بعد فوراً بعد رقص شروع ہو رہتا اور یوں اس کی گلوخلاصی ہو جاتی، اللہ اللہ خیر صلا۔ مگر پروڈیوسر صاحب نے اس کو یوں جھڑکا تھا گویا یہ ڈرامے کا مرکزی کردار ہے جس کو تقریباً وقت سٹیج پر گزارنا ہو۔ ڈرامے کو شروع ہوئے اب تھوڑی دیر ہو گئی تھی۔ اسے ابھی بھی خاصہ وقت میسر ہے۔ یہ گیلری میں دیوار سے کرسی ٹکا کر بیٹھ گیا اور سگرٹ سلگا لی۔ ڈریسنگ روم اور سٹیج کے بیچ اس مختصر گیلری میں تھیٹر عملے اور فنکاروں نے اودھم مچا رکھا ہے۔ ایک کونے پر ڈریسنگ روم جبکہ دوسرے پر سٹیج تھا، دونوں ہی سرے اس وقت بقعہ نور بنے ہیں۔ بیچ کی گیلری میں صرف ایک زرد بلب روشن ہے جس کی میلی روشنی نے لمبوترے راستے میں افسردگی بھر رکھی بھر دی ہے۔

سگرٹ کا اثر تھا یا گیلری میں بے وجہ اداسی، ماضی کی یاد شوکی کو غڑاپ سے نگل گئی۔ اس گیلری سے اس کی بے شمار یادیں وابستہ ہیں۔ گو شوکی کو سٹیج پر ڈرامے کرتے چھ برس سے زائد ہوچلے تھے مگر اس مقام سے نسبت اس سے بھی پہلے کی ہے۔ شوکی کا باپ بائیس سال تک اسی تھیٹر میں باہر جنگلے پر ٹکٹ چیک کرنے اور مفت بروں پر نظر رکھنے کا بیگار کرتا رہا جبکہ ماں کی ساری جوانی اسی سٹیج

پر رقص کرتے گزر گئی۔ تب سٹیج کا رنگ کچھ جدا ہوا کرتا تھا۔ فنکار کی تب عزت تھی، جیسے ہی شو ختم ہوتا، یہی گیلری مداحوں سے یوں بھر جایا کرتی تھی کہ فرداً فرداً سب پر داد کے ڈونگرے برستے اگلے شو کا وقت ہو جاتا اور پھر سب پر بھاگم بھاگ طاری ہو جاتی۔ ہر رات دوسرا شو چڑھتا تو سب چھوٹے بڑے فنکار تعریفوں کی گرمائش سے جیسے میدے کا کلچہ پھول جائے، کُپا ہوئے سٹیج پر نمودار ہوتے۔

ہال میں پٹتی تالیوں، بڑھتے شور سے خیال ٹوٹ گیا۔ اس نے سگرٹ کی راکھ جھاڑ کر ایک معمولی کش لیا۔ ماجھو چاچے کی لڑکی نگینہ ایک واہیات گانے پر بے ہنگم رقص کر کے لوٹ رہی ہے۔ تیز بینگنی رنگ کی پسینے میں نچڑتی کرتی پہنے یہ بلا کی چست نظر آتی ہے۔ نیچے لاچہ ہے جو خاصہ گھیردار ہے مگر پھر بھی جب قدم آگے رکھتی تو ٹانگیں مناسب حد تک عریاں ہو جاتیں۔ پھر اگلے ہی قدم پر گو گھیر سے عریانی ڈھک جاتی مگر اس چھپن چھپائی سے دیکھنے والے کی آنکھ میں تشنگی سی رہ جاتی۔ شوکی ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔

نگینہ کے جاتے ہی اس نے بوجوہ سگرٹ دیوار سے رگڑ کر بجھایا اور ادھ پیا ٹوٹا جیب میں ٹھونس دیا۔ اب گیلری میں سیٹھ واجد آتا ہوا دکھائی دیا۔ سیٹھ صاحب کا شہر کی لوہا مارکیٹ میں اچھا خاصہ گودام تھا اور کچھ ہفتے قبل سیٹھ صاحب کا چھوٹا لڑکا بلدیاتی ووٹوں میں ناظمی کا الیکشن جیت کر آیا تھا۔ یہ ادب سے کھڑا ہوا اور جھک کر سیٹھ صاحب کو سلام کیا۔ سیٹھ صاحب سے ایک قدم پیچھے چلتے منشی نے شوکی سے شب چوہدری کے بارے استفسار کیا تو شوکی نے بے دلی سے پروڈیوسر صاحب کے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہ دونوں وہیں سے الٹے قدموں لوٹ گئے۔

یہ پھر سے وہیں بیٹھ رہا۔ گیلری سے ابھی ابھی گزری نگینہ سے ہوتی سیٹھ واجد اور پروڈیوسر صاحب کا کمرہ، سوچیں پھر سے در آئیں۔ اب تھیٹر میں مداحوں کی بجائے گاہک آنے لگے ہیں، شوکی نے سوچا۔ فقرے بازی فحش ہو گئی۔ رقص بس واہیاتی رہ گیا۔ نگینہ کو ہی دیکھ لو، لاکھ دلوں پر راج کرتی ہو مگر بے حیا، کیسے مٹک مٹک کر چلتی ہے۔ جسم کی نمائش یوں کرتی ہے جیسے سربازار ننگا گوشت بکنے کو ٹنگا ہو۔ پھر باہر سٹیج کے ٹکٹ کاؤنٹر کا منشی الگ دلال بنا سودے کرواتا ہے۔ اللہ کی پناہ، اب تو آئے روز چھاپے پڑتے تھے۔ تھیٹر میں جہاں کبھی سُچا تماشہ ہوا کرتا تھا، خود تماشہ بن کر رہ گیا ہے۔ خود اسے انھی واہیاتیوں میں ناحق دو ایک بار حوالات کا مزہ چکھنا پڑا تھا۔

خیالات جھٹک، اس نے سگرٹ دوبارہ سلگایا ہی تھا کہ پروڈیوسر صاحب شبانہ کی ماں کو ساتھ لیے آتے دکھائی دیے، بوجوہ سگرٹ پھر رگڑ دیا۔ سارے ایکسٹرا، عملہ آگے بڑھ کر پروڈیوسر صاحب کو سلام کرتے اور ان کے لیے ہٹ کر راستہ چھوڑ دیتے۔ شبانہ ان کے ساتھ نہیں تھی، جس سے شوکی کو الجھن سی ہونے لگی۔ کچھ ہی دیر میں اس کا سین جاری ہونا تھا اور یہ نہ جانے کہاں رہ گئی ہے۔ یہ دونوں ڈریسنگ روم کی جانب نکل گئے۔ اس کی جانب دونوں میں سے کسی ایک نے بھی توجہ نہیں دی۔

شوکی کا سین شروع ہوا تو سٹیج پر داخلہ سکرپٹ کی عین ضرورت کے مطابق نہ ہو پایا۔ شبانہ خاصی دیر تک سیٹھ صاحب کے ساتھ باہر دفتر میں بیٹھی رہی تھی۔ جب ڈریسنگ روم کی جانب آئی تو بال الجھے اور میک اپ جیسے بہہ رہا تھا۔ اس کو سلجھاتے دیر ہو گئی اور یوں سٹیج پر جاری سین میں فقرے بازی کو خواہ مخواہ طول دینا پڑ گیا۔ سٹیج کے پیچھے اسی سبب کچھ بدمزگی پیدا ہو گئی۔ سب شوکی پر برس رہے تھے اور یہ سب پر بھنایا ہوا کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

اسی کشمکش میں جب سٹیج پر اترا تو ڈائیلاگ ایسے الجھے اور پھیکے انداز میں ادا کیے کہ سکرپٹ کے کرداروں سے پہلے بھرے ہال نے اس کے کھڑے کھڑے لتے لے لیے۔ سین کا تو ویسے بھی ستیاناس ہو چکا تھا، اداکاروں نے بھی اس موقع کا خوب فائدہ اٹھایا۔ اگلے دس منٹ تک فقرے بازی میں اس کی وہ خبر لی کہ پٹتی تالیوں، قہقہوں اور سیٹیوں سے کان بہرے ہو رہے ہیں۔ چونکہ یہ سٹیج پرآئے روز کا معاملہ تھا تو یہ اس کھینچ تان کے جواباً بس سٹیج پر یہاں وہاں چکر لگاتا یا بھرم رکھنے کو ہر فقرے پر خباثت سے ہنس رہتا مگر بٹتی داد کے جوش میں ڈرامے کے ہیرو نے شوکی کی ماں بارے ایک فقرہ کس دیا۔ بھلے یہ معمولی سی بات تھی مگر فقرہ گویاپتھر پر بھاری ہتھوڑے کی طرح گرا۔ اچھا خاصا شوکی اداس، بچوں کی طرح پھوٹ کر یوں رو دیا جیسے پہاڑ کی پتھریلی چٹان پر آخری ضرب پڑنے سے پانی کا فوارہ ابل پڑتا ہے۔ مجمع کو تو جیسے لقوہ مار گیا ہو، مگر جلد ہی دھیان پس منظر سے موسیقی کی لے بلند ہونے پر بٹ گیا۔ شوکی دھیرے سے قمیص کی آستین آنکھوں پر ملتا، چھوٹے بوجھل قدموں سٹیج سے یوں اترا جیسے کوئی ناکام چلتا ہو۔

سٹیج پر اب شہر کی مشہور رقاصہ شب چوہدری جلوے دکھا رہی ہے، اسے اپنے بھائی شوکی کے برعکس سویر تک آنسو بہانے کی فرصت ملنے والی نہیں تھی۔

(جون، 2013)

پہلی صف

اکبر خان جتوئی جدی پشتی زمیندار تھا۔ اس کی حویلی ایک بیگھے رقبے پر اس کے دادے نے بڑی باڑھ کے بعد دوبارہ تعمیر کی تھی۔ ساتھ ہی اس کے کئی باڑے اور ایک ڈیرہ جس پر ہر وقت مزارعوں اور باڑے کے ماجھیوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ تین بیویاں، دو جوان جہاں بیٹے جو زیادہ تر شہر میں رہتے، کئی گھیر زمین کی جاگیر، جس میں کئی ایکڑ آموں کے باغوں کے علاوہ سال میں ایک اناج اور دوسری صاف منافعے کی فصل بوئی جاتی تھی۔ سب کچھ تھا مگر جیسے کمی ہوا کرتی ہے، اکبر خان کی بھی دو کمزوریاں تھیں۔ اول، ضرورت سے زیادہ زمین ہونے کے باوجود وہ مزید سمیٹنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکتا تھا اور دوم حویلی کی زنان خانے میں تین بیویوں کے باوجود بھی وہ ڈیرے پر عورتیں لائے بغیر گزارہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہر سال کچھ نہ کچھ زمین یا تو کسی مجبور سے خرید لیتا، نہیں تو ہتھیانے تک کے لیے اس کے کاردار موجود تھے جن میں اکثر چھٹے ہوئے مفرور تھے جو اس کے ڈیرے پر پناہ لیے ہوئے تھے۔ پھر جبلی ہوس کے لیے اکثر تو ناچنے والی کنجریاں بلا لاتا ورنہ مزارعوں کی عورتیں تو کھونٹی پر بندھی گائیوں کی طرح ہر وقت ہی اس کی خدمت واسطے موجود تھیں، یہاں بھی جو مرضی سے آ جاتی تو سستے خیراں نہیں تو اس کے کاردار پگڑی لے کر جاتے اور رات کے نکاح میں باندھ کر لے آتے۔

جو بھی تھا، ان دو قباحتوں کے علاوہ اکبر خان بھلا آدمی تھا۔ پانچ وقتی جماعت کا نمازی، مسجد کا خادم۔ سارا خرچہ خود تن تنہا اٹھاتا، مولوی کا ماہانہ وظیفہ یاد سے اس کی کوٹھڑی میں بھجوا دیتا، اسی طرح مسجد میں خدا کے مسافروں کے لیے دو وقت کھانا بھی اکبر خان کی حویلی سے ہی پک کر آیا کرتا تھا۔ عرس میلے، زیارت پر کئی ہزار روپوں مالیت کا گھی مکھن اور نذرانہ علیحدہ سے پہنچاتا کہ اس کی فصل، حویلی اور ڈیرے میں مرشدوں کی برکت اور خدا کا سایہ قائم رہے۔ ہاں، مسجد میں بس اسے ایک خبط تھا کہ ہمیشہ پہلی صف میں عین ملا کے پیچھے نماز پڑھتا، مجال ہے کہ اس کی جاء نماز پر کوئی دوسرا نمازی قدم ڈالنے کی بھی جرات کر سکتا ہو۔ لوگ اس کے منہ پرگاؤں میں تو کچھ نہ کہتے تھے مگر اکثر نائی موچی بازار میں اکٹھے ہوتے تو دبے دبے اکبر خان کی اس عادت کو برا جانتے۔ جیسے، نورا حجام ایک دن ریتی پر استرا تیز کرتے ہوئے سامنے بیٹھے شوکے موچی سے کہنے لگا کہ،

'پہلے تو بس صف میں جگہ تھی، اب اکبر خان نے مصلیٰ تک اپنے لیے علیحدہ سے لگوا لیا ہے۔ آگے مولوی کا مصلیٰ ہے تو ایک سجدہ چھوڑ کر اس کا مصلیٰ بچھا ہوا ہے۔ کاردار نے بتایا کہ خان نے یہ مصلیٰ خصوصاً مدینے سے منگوایا ہے"۔

شوکا موچی جو بے دھیانی سے اس کی بات سنتے ہوئے گھسے جوتوں میں سوئے تار رہا تھا، مدینے کا ذکر سن کر ایک دم مودب ہو گیا۔ دونوں انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگائے اور کہنے لگا، "مولا برکت ڈالے۔ خدا جانتا ہے بستی میں اس کی وجہ سے مسجد میں سب کو سہولت ہوتی ہے۔ پانی سارے پہر ٹونٹیوں تک میں آتا ہے، پھر مسافروں کے لیے اس نے جو بندوبست کر رکھا ہے، مولا کی اس کو دین ہے۔"

اس پر نورے نے برا سا منہ بنا کر مسافروں کی آل اولاد میں حرام نطفہ گھسیڑا اور بولا،

" شوکے، حرام پینا نہ کر۔ خان کی خود کی حالت یہ ہے کہ رات عورتوں کی گود اور فجر مولوی کے پیچھے گزرتی ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے، میں نے تو فجر سے توبہ کر لی۔ سویر وہ نام تو خدا کا پڑھ رہا ہوتا ہے مگر منہ کپی کی باس مارتا رہتا ہے۔ جماعت حرام ہو تو ایسی مکروہ نماز کا فائدہ؟" اس پر شوکے نے بھی استغفار پڑھی، پھر گویا ہوا کہ،

"باقی تو سب ٹھیک ہے، بس اس کی یہ عورتوں والی بد عادت چلی جائے تو بندہ ہیرا ہے، ہیرا۔" اب کے شفیے درزی نے شلوار کے نیفے کا عرض سلائی مشین میں فٹ کیا اور ہتھ دستی سے کھٹ کھٹ مشین چلاتے لقمہ دیا،

"بات یہ ہے بھائیو کہ اکبر خان مسجد میں نماز پڑھ کر خدا کو راضی رکھتا ہے، مگر پہلی صف میں کھڑے ہونے کی عادت اس کے دادے والی ہے۔ میرا ابا کہا کرتا تھا کہ جتوئیوں کو خدا کی زمین تو عطا ہوئی ہی ہے مگر وہ مسیت کے بھی زمہ دار ہیں۔ کہو تووہ مسیت میں بھی خدا کے شریکے ہیں"۔ ان لوگوں کی یہ بحث ہمیشہ کی طرح تبھی بس ہوئی جب اکبر خان کا منشی طیفا وہاں آ کر بیٹھ گیا۔ محفل جما، حقہ سلگا کر تاشوں کی بازیاں چلنے لگیں۔ شوکے، نورے اور شفیے نے اپنا دھندہ ویسا چھوڑ کر دن بھر کی کمائی تھڑے پر جوئے میں جھونک دی۔

شام میں اکبر خان باہر ہوا خوری کو نکلا کرتا تھا۔ اس روز بھی جب وہ بازار میں نکلا تو منشی بازی آدھی چھوڑ کر اس کے پیچھے دوڑا تو شوکے نے منہ نیچے کر کے پاس بیٹھے شفیے کی ران دبا کر کہا کہ، "لے بھئی شفیے،طیفا دلال اپنے خان کے لیے رات کا انتظام پوچھنے گیا ہے۔" شوکا جو ان دونوں کو سن رہا تھا طیفے کو واپس آتا دیکھ کر بولا، "رب جانے کس مزارعے کی فصل میں یہ حرامی کھوٹ نکالے گا۔" طیفے نے جیسے بات سن لی ہو، ھنستے ہوئے رقم سمیٹ کر بولا،

"آج کی بازی تو سجنو میں لے ہی گیا، اب دیکھو کس دن خان کا باز تم حرامزادوں کی چڑیوں پر نظر ڈالتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے طیفے کے انداز نے گویا ان کمی کمینوں کے گھروں کی عزت کے کونے کھدروں تک کو کھنگال لیا ہو۔

اس کی موجودگی میں تو کسی کو ہمت نہ ہوئی، اس کے جانے کے بعد سب نے خان اور اس کے دلال کی زبانی کلامی خبر لی۔

منشی طیفے کا کام دلال جیسا ہی تھا۔ وہ اکبر خان کے لیے مزارعوں کی عورتیں ڈھویا کرتا تھا۔ اس کے پاس سب کا حساب تھا۔ جس مزارعے کی کوئی عورت تارنے والی ہوتی تو اس کے حساب میں ردبدل بھی ہو جاتا تھا۔ اکثر تو اس کی ضرورت بھی پیش نہ آتی تھی۔ اس روز بھی، جب وہ گجو کی بیٹی کو ساتھ لیے ڈیرے پر پہنچا تو شام پڑنے والی تھی۔ اکبر خان کچھ افسردہ سا باہر کھلے میں چارپائی پر لیٹا تھا۔ گجوکی بیٹی کو وہ اندر چھوڑ کر خان کے پاس آیا تو اکبر خان نے اسے منع کر دیا۔ طیفے کو سمجھ نہ آئے کہ ماجرا کیا ہے۔ اکبر خان نے اٹھ کر حقے کا پائپ چارپائی کی پائنتی میں پھنسایا اور بولا،

"جگو سپیرا سنا، بستی میں واپس آ گیا ہے؟" اس پر طیفے نے بتایا کہ وہ دو تین دن ہوئے اپنے کڑے کے ساتھ واپس آ گیا ہے۔ اس بارکہتا ہے کہ اچھے خاصے رنگ برنگے چھوٹے بڑے کئی سانپ پکڑلایا ہے۔ اسی وجہ سے بستی میں اچھی خاصی رونق لگی ہوئی ہے۔ اکبر خان نے ان سنی کر کے پوچھا،

"نوری بھی آئی ہے؟"

گو طیفا معاملہ تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا بس اکبر خان کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

نوری جگو سپیرے کی سب سے بڑی لڑکی تھی۔ بس پچھلے دو برسوں میں اس کی جوانی دم خم سے نکلی تھی۔ سانولی اور بھرے گالوں والی۔ لانبی زلفیں گُت بنا کر یہاں وہاں گھماتے پھرتی۔ نکلتا قد اور ابھرا سینہ خم کھاتی کمر میں، کیسا بھلا نظر آتا۔ باپ کے ساتھ سانپوں کا تماشہ

کرنے نکلتی تو لوگوں کی نظریں اس کو ٹٹولتیں، سنپولیوں جیسی ہر جسمانی خم دار ادا مسحور کن سی سب کو محو کر دیتی، یہاں تک کہ جگو سپیرے کو لاٹھی زمین پر مار مارلوگوں کو سانپوں کی طرف متوجہ کرنا پڑتا۔ الغرض، جس کو دیکھو سانپوں کے بہانے نوری کو دیکھنے نکلا کرتا اور جب تماشہ تمام ہوتا تو کئی سو روپے بے سود پھکیوں پر خرچ کر کے اٹھتا اور کہو تو سمجھتا ،منافعے میں رہا۔ اکبر خان نے جب سے نوری کا یہ نظارہ کیا تھا ،باؤلے کتے جیسے ہر وقت اس کی مشک مارتا رہتا تھا۔ اس رات بھی گجو کی بیٹی جب اس کے بستر میں گھسی تو خان کا دھیان دور بستی میں نوری کی طرف بٹا ہوا تھا، سویر واپس جاتے ہوئے گجو کی بیٹی شرمندہ سی روانہ ہوئی ۔اگلے روز تو جیسے آپے سے باہر ہو گیا۔ تین نمازیں وہ مسجد نہ جا سکا، دبدبہ ایسا تھا کہ پہلی صف میں اس کی جگہ پر کسی دوسرے کو کھڑے ہونے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کا مصلیٰ ویسا ہی خالی چھوڑ کر نمازیں ادا کرنی پڑیں۔ بات بازار میں یوں نکلی کہ اس روز نورے حجام کا گلہ یہ تھا کہ تین نمازیں صف میں خالی مصلے کی وجہ سے مکروہ ہو گئیں۔ خان بدبخت، مسیت جائے یا نہیں، نمازیں سب کی کھوٹی ہو جاتی ہیں۔

طیفے منشی کو آج تیسرا دن تھا کہ نوری کے پیچھے پیچھے کتے کی طرح سونگھ لے رہا تھا مگر یہ اور اس کا باپ تھے کہ کہ اس کے ہاتھ نہ آتے۔ جگو جیسے بھانپ گیا ہو تو ایک پل کو جھگی سے نکلے تو دوسرے میں پھر گھس گئے۔ پچھلی شام سانپوں کا تماشہ بھی نہیں ہوا تھا تو طیفے کی مشکل اور بھی بڑھ گئی۔ تبھی اس کو جب اکبر خان نے خوب لعن طعن کیا تو اس نے نوری کے باپ جگو سپیرے کو اس کی جھگی میں جا لیا۔ نوری کے لیے خان کا پیغام پہنچایا جس پر جگو کی جیسے باچھیں کھلی اور کندھے ڈھلک کر رہ گئے۔ پہلے تو پس و پیش سے کام لیا مگر پھر جب طیفے نے ہلکے سے اسے خمیازے کی بابت اندازہ کروایا تو منت ترلے پر آ گیا۔ منمنا کر ہاتھ جوڑے، مجبوری سے عرض کی اور آخر میں جیسے باور کرا رہا ہو،

"مائی باپ، ہم سپیرے آزاد ہوتے ہیں۔ عورت زات تو ویسے بھی اپنے من کی غلام ہے، اس کو کوئی قابو کر پایا ہو؟ نوری میرا مال ہے مگر اس کا فیصلہ تو وہی دیوے گی۔"

طیفے کو سمجھ آ گئی کہ یہ کم زات اس کو ٹال رہا ہے ورنہ عورت زات کی ایسی کہاں جرات جو فیصلہ کرے اور یوں انکار کر پاتی۔ وہ تو کلے سے لگی گائے ہے جسے سبزے کی لالچ دو اور اسے چاہیے کہ ساتھ ہنکائی چلی جائے۔ مزارعوں کی طرح گو جگو سپیرا خان کا محتاج تو نہیں تھا مگر پھر بھی خان بہرحال خان تھا۔ اس چپے زمین کا مائی باپ جہاں سے جگو سپیرا نہ صرف سانپ پکڑا کر لاتا ہے اور یہاں گاؤں گاؤں ان سانپوں کے بل بوتے پر اپنے کڑے کا پیٹ بھرتا ہے۔ بالواسطہ، جگو سپیرا اکبر خان کا دیا نمک ہی کھا رہا ہے۔ یہ سب سوچ کر طیفے نے اس کو کچھ مہلت دی اور بازار میں تھڑے پر جا پہنچا۔ تینوں کمی اکبر خان کی نوری واسطے رسے تڑوانے کی بحث لیے ہی بیٹھے تھے۔ ان کو یہ تو معلوم تھا کہ نوری آج نہیں تو کل خان کی کھونٹی سے بندھ ہی جائے گی، دیکھنا یہ تھا کہ یہ ناگن کس منتر سے کیل جائے گی۔

چوتھے دن اکبر خان کا پیمانہ لبریز ہو گیا جب نوری نے اس بابت ٹکا انکار کر دیا۔ بیٹی کی زبان میں نوری کا باپ بھی منت ترلے کرتا اڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس پر خان کی بس ہو گئی۔ کاردار کو کہلوا کر نوری کو جھگی سے اٹھوا لایا۔ پہلے تو اسے سمجھایا، پھر نان نفقے کا یقین دلایا مگر یہ تھی کہ جیسے ناگن پھنکارتی اس کو قریب نہ لگنے دے رہی تھی۔ خان نے جب حتمی طور خود اس سے بات کی تو تھوک کر بولی،

Thank You for previewing this eBook

You can read the full version of this eBook in different formats:

- HTML (Free /Available to everyone)
- PDF / TXT (Available to V.I.P. members. Free Standard members can access up to 5 PDF/TXT eBooks per month each month)
- Epub & Mobipocket (Exclusive to V.I.P. members)

To download this full book, simply select the format you desire below